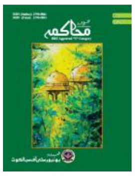

علمی و تحقیقی مجلہ ”محاکمہ“ یونیورسٹی آف سیالکوٹ

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

عدنان مسعود، ایم فل اردو اسکالر، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

ڈاکٹر الماس خانم (Corresponding Author)، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

dr.almaskhanum@gcu.edu.pk

نیّر اقبال علوی کا افسانوی مجموعہ ”جیب کترے“ ایک جائزہ

A review of Nayyar Iqbal Alvi's fictional collection "Jeeb Kutre"

Adnan Masood, M.Phil Scholar,GC University,Lahore

Dr Almas Khanum, (Corresponding Author), Department of Urdu.GC University,Lahore

Abstract

This paper offers a critical overview of *Jeeb Katrey*, a short story collection by the contemporary Urdu fiction writer Nayer Iqbal Alvi. Living between Pakistan and Germany, Alvi captures the cultural, moral, and emotional dissonance of modern society through a unique literary lens. The collection includes seventeen stories that portray not only the decline of traditional values but also the moral decay permeating both Eastern and Western societies. The title story, *Jeeb Katrey* (Pickpockets), is an allegorical narrative highlighting social and political corruption in Pakistan, symbolized through the decay of the once-vibrant Ratan Cinema. Other stories like *Dar-e-Munfa'at par Dastak*, *Koakh Mein Jame A'laq se Guftagu*, and *Ababeelain Kyun Nahin Aatein?* Address exploitation, gender-based violence, and political helplessness, with powerful female characters often at the center.Alvi's characters are not bound by geography, religion, or race; rather, they represent a universal human experience caught in the crossfire of greed, oppression, and disillusionment. The stories merge emotional intensity with socio-political commentary, exposing the duplicity and decay of modern power structures. His narrative technique blends realism with symbolism, personal pain with collective trauma, and nostalgia with harsh critique. Through rich imagery, dialogue, and internal reflection, Alvi builds a literary landscape that transcends boundaries while remaining rooted in local realities.This collection not only revives the tradition of socially engaged storytelling but also serves as a mirror to contemporary crises—making Alvi's work a significant contribution to modern Urdu fiction.

مخصوص ماحول میں پرورش پانے والا ذہن خاص دائرے میں ہی سوچنے کا پابند ہوتا ہے، مگر جب پروازِ فکر روایتی حصار کو مسمار کر کے فضائے بسیط میں اڑان بھرتی ہے تو گویا ایک جہانِ تازہ اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ ذہن نئے

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

خیالات سے نہ صرف آشنا ہوتا ہے بل کہ ان خیالات کو گویائی کا جامہ بھی پہناتا ہے۔ یوں تو سب انسان ہر طرح کے کمالات میں یکسانیت کے درجے پر فائز ہیں، مگر عمل ان میں تحصیص کا باعث بنتا ہے۔ بقول علامہ اقبال:

ع عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی(۱)

انسان ہمہ وقت عمل کیے جارہا ہے گویا عمل ہی زیست ہے، انسان کا تعارف ہے اور باعثِ ندامت و سرشاری ہے۔ عمل نہ ہو تو تصورِ زیست مفقود ہو جاتا ہے۔ انسان دوسرے انسانوں کا مشاہدہ تو کرتا ہے مگر اس سے سیکھنے کی طرف توجہ کم دیتا ہے۔ انسانوں کو ان کے حالات وواقعات سے آگاہی دینے کا فریضہ کسی بھی سماج کے تخلیق کار سرانجام دیتے ہیں۔ ماضی میں جھانکیں تو معلوم ہو گا کہ ہر صدی کا قصہ کسی نہ کسی صورت میں تخلیق کاروں کے ہاں ملے گا۔ یہ کسی بھی سماج کا غیر معمولی ذہن ہوتا ہے۔ یہ افراد کو ان کی تہذیب، روایات اور اَقدار سے نہ صرف آگاہ کرتا ہے بل کہ جوڑنے کی مساعی بھی کرتا ہے۔ عصرِ حاضر کے تخلیق کاروں میں سے ایک اہم نام نیر اقبال علوی کا ہے۔ ان کا وصفِ خاص یہ ہے کہ وہ دو تہذیبوں کے شاہد ہیں۔ وہ نہ صرف پاکستان کی روایات کے امین ہیں بل کہ جرمن تہذیب سے بھی خوب آشنائی رکھتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں انھوں نے دو طرح کی سماج، تہذیب اور روایات سے وابستہ انسان کا مشاہدہ کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر انوار احمد:

> "وہ فیصل آباد کا "جم" ہے تو لاہور کا "پل" مگر اسے اور اس کی اولاد کو جرمنی اور بوسنیا نے معاشی اور جذباتی سہارا دیا ہے لیکن اپنے دیس کے احوال سے ایک طرح کا اضطراب بھی دیا ہے"(۲)

اسی مشاہدے کو بیان کرنے کے لیے انھوں نے اظہار کا جو ذریعہ منتخب کیا، وہ افسانہ نویسی ہے۔ ان کے افسانے پریم چند کے دھیمے پن، شائستگی اور منٹو جیسی بے ساختگی اور کھرے لہجے کا عمدہ امتزاج ہیں۔ زیرِ نظر افسانوی مجموعہ "جیب کترے" ملٹی میڈیا افیئرز سے ۲۰۲۴ء میں منظرِ عام پر آیا ہے، جو سترہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ یہ نیرؔ اقبال کا آٹھواں افسانوی مجموعہ ہے۔ ان افسانوں کے موضوعات میں ہمیں تنوع ملتا ہے جو کہ ان کے وسیع اور عمیق مشاہدے کا ثبوت ہے۔ ان افسانوں میں جہاں وہ تہذیب، روایات اور اخلاقی اقدار کا کھوج لگاتے ہیں وہیں وقت کے ساتھ ساتھ انسانی رویوں میں بپا ہونے والی شکستگی اور زوال کا نوحہ بھی رقم کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا لینڈ سکیپ کسی مخصوص جغرافیائی علاقہ تک محدود نہیں بل کہ لاہور سے فرینکفرٹ اور غزہ سے برلن تک بسنے والے انسان کے زوال کا نوحہ

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

ہے۔ نیر اقبال نے ان کرداروں کو کسی خاص خطے سے منسوب نہیں کیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی رقم طراز ہیں:

> "ان کہانیوں کے کرداروں کا بھی کوئی ایک وطن نہیں ہے اور نہ ہی ان کرداروں کی نسبت کسی ایک دھرم، عقیدے، رنگ اور نسل سے ہے۔ یہ انسان کی کہانی ہے، جسے نیر اقبال علوی نے صاحب نے بڑے نستعلیق انداز میں بیان کیا ہے"(۳)

نیر اقبال علوی کا افسانہ "جیب کترے" کھو جانے والی تہذیب کی جستجو کی داستان ہے۔ وہ جب طویل قیامِ جرمنی کے بعد لاہور لوٹتے ہیں تو اپنے دیس کے رنگ روپ میں تغیر پا کر انتہائی رنجیدہ و دل گرفتہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کرب کو بڑی شدت سے الفاظ میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے شک ایک طویل عرصہ پردیس میں رہے مگر انھوں نے اپنے باطن کو پردیسی نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے ظاہری دوری کو اپنے اور اپنی سرزمین کے مابین حائل نہیں ہونے دیا۔ وہ باطنی طور پر اپنی روایات سے جُڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس نے ان کے الفاظ کو تاثیر بخشی اور ان کی تحریر سے اجنبیت کی بُو نہیں آتی۔ پڑھنے والا ایک لمحہ کے لیے خود کو اس عہد میں بھی محسوس کرتا ہے اور اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ بھی جنم لیتا ہے۔ یہ ان کے افسانوں کا بنیادی وصف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بغیر تعلق اور ربط کے محض لفظوں کی اصنام گری نہیں کرتے بل کہ پہلے اس کہانی کا حصہ بنتے ہیں، اسے اپنے اندر اتارتے اور محسوس کرتے ہیں اور پھر وہ کہانی خود ان کو اپنا آپ پیش کرنے کے لیے اُکساتی ہے۔

بنیادی طور پر "جیب کترے" لاہور کی معروف و مقبول میکلوڈ روڈ پر واقع "رتن سینما" کے اجڑنے کی داستان ہے۔ کسی بھی معاشرے میں سینما کا ہونا اس معاشرے میں بھرپور زندگی کی علامت ہوتا ہے۔ ایک وقت تھا جب لاہور میں سینما کا ہونا نہ صرف جزوِ لازم تھا بل کہ ایک صحت مند تفریح کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اپنی فیملیز کے ساتھ سینما گھروں کا رخ کرتے تھے۔ سینما اعلیٰ انسانی قدروں کو قائم رکھتے ہوئے معاشرے میں مثبت کردار ادا کرنے کا باعث تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سینما کے ختم ہونے کے ساتھ انسانی قدریں بھی پامال ہو گئیں۔ لوگ ایک دوسرے سے دور ہو گئے اور مغائرت کا شکار ہو گئے۔ اسی کے ساتھ ہی یہ افسانہ اپنی علامتی معنویت کے اعتبار سے بھی جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ جیب کترے سے مراد ہر اس بااختیار شخص کو لیا گیا ہے، جس نے اپنی اپنی حیثیت میں اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے ملک و قوم کی ساکھ کو ٹھیس پہنچائی اور تخریبی کردار ادا کیا۔

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

اس افسانے کے دو بنیادی کردار ہیں۔ جو جدید عہد کی رفتار کے ساتھ چلتے ہوئے بھی مڑ کر ماضی کو یاد کرتے ہیں۔ کاشف علی میکلوڈ روڈ سے گزرتے ہوئے آنکھوں دیکھا حال مدیحہ کو فون پر سناتا ہے، جو کہ شادی کے بعد لندن میں مقیم ہو چکی ہوتی ہے۔ ابتدا ایک منظر سے کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ درپردہ ایک عمارت کے اجڑنے کی داستان میں پاکستان کی حالتِ زار کی عکاسی کی گئی ہے:

"یہ حرماں نصیب عمارت ایک وسیع و عریض رقبے پر تعمیر کی گئی تھی جس کی خرابی و تباہی کو دیکھ کر میں مبہوت سا اداسیوں، حسین یادوں اور بدذوقی کے بھنور میں گردش کرنے لگا۔ کشادہ و مصروف ترین سڑک کنارے لگ بھگ سو فٹ چوڑے فرنٹ پر دو عدد مین گیٹ ایک برائے وُرُود جب کہ دوسرا اخروج کے لیے استعمال ہوا کرتا، اب دونوں بھاری بھرکم آہنی دروازے زمین میں دھنسے ٹانگوں سے معذور کسی پہلوان کی طرح لوٹ کھسوٹ کرنے والے ہتھیاروں کی کارستانیوں کی کتھا بیان کرتے دکھائی پڑتے۔ میں جابجا اُکھڑی ہوئی سرخ اینٹوں والے فرش پر چلتا ہوا اس برآمدے کے سامنے جا پہنچا جس کے چار سفید مرمریں زینے شائقین کو بڑے ہال کے صدر دروازے تک لے جایا کرتے۔ اس کشادہ راہداری سے ملحقہ دائیں بائیں لوہے کی سلاخوں والی کھڑکیاں جن کے اندر قیدیوں کے مانند ٹکٹ فروش اور باہر دھکم پیل کرتے منچلے حصولِ ٹکٹ کی جان توڑ کوشش کیا کرتے۔ جہاں رونق و گھما گھمی زندگی کو متحرک و منور کیا رکھتی۔ اس آسیب زدہ عمارت کی اب تمام کھڑکیاں اور دروازے لاوارث مکان کی طرح کھلتے تھے اور ہوا کے جھونکوں میں ان کی چرچراہٹ، اڑنے والی خاک اور دھویں کے مرغولے روشن دن میں بھی ایسا تاثر بنانے میں مصروف گویا نحوست بال بکھرائے بین کر رہی ہو۔ اس خستہ حال محل نما عمارت کی بلند و بالا دیواریں اور منڈیریں اچھے وقتوں میں شہر کے نامی گرامی مشّاق پینٹروں کے ہاتھوں سے تشکیل کردہ تصویروں اور خوش خطی سے لکھے آنے والی فلموں کے ناموں سے مزین ہوا کرتیں۔ لیکن مقامِ حیرت کہ اب .... ٹکٹ گھر کی دونوں سلاخوں والی کھڑکیوں کے ماتھے پر نیلے رنگ سے جلی حروف میں لکھی گئی عبارت "جیب کتروں سے ہوشیار رہیے" کے علاوہ یہاں نہ کوئی دوسری تحریر اور نہ ہی کوئی تصویر باقی بچی تھی"(۴)

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

اختتام میں مصنف نے کاشف علی کی زبانی جو تبصرہ ملک کی حالتِ زار کے متعلق دیا وہ گویا ناپسندیدہ ہونے کے باوجود بھی ایک حقیقت ہے۔ اس سے نظریں نہیں چرائی جاسکتیں۔ یہ گویا ہر باشعور اور سیاسی بصیرت رکھنے والے کی دل کی پکار ہے:

"مادرِ وطن کا جنم ہوئے بمشکل دو عشرے بھی نہ گذر پائے، گویا عین عالمِ شباب میں تھی جب........ جیب کتروں نے اس کے نرم و نازک صندلیں بدن کو بڑی کلاکاری کے ساتھ کترنا شروع کیا۔ کسی نے اس کے نازک کانوں سے دیدہ زیب جھمکے نوچے تو کسی ظالم نے چاند سی پیشانی سے مرصع طلائی جھومر اُچکا، کسی بدمعاش نے گول مٹول کلائیوں سے جڑوا کنگن کھینچے تو کسی لفنگے نے مرمریں صراحی دار گُلو سے نولکھا ہار اڑایا۔ یہ ایسے بے حمیت جیب کترے اور اتنے ضمیر فروش نوسرباز کہ اگر ایک نے نازک کمریا سے کمر پٹکا کاٹا تو دوسرے بے حیا نے تلے کے ریشوں سے بنا ہوا ازار بند بھی نہ چھوڑا۔ ان بے غیرت جیب کتروں نے، جو ساتھ ساتھ بہروپیے بھی تھے، وقتاً فوقتاً سوانگ رچائے۔ کبھی کوئی راہبر بنا، کبھی مبلغ، کبھی مادرِ وطن کا پاسبان، کبھی قافلے کا سالارِ اعلیٰ، کبھی ترازو تھامے منصف، کبھی سماج آئینہ دکھانے والا قلم کار، کبھی بڑا تاجر تو کبھی دو ٹکے کا آجر، کبھی جنت کی نوید سنانے والا ہرکارہ تو پھر کبھی قوم کی خدمت کرنے والا خادمِ اعلیٰ۔ یہ سب کے سب فریبی، مکار جن کو مادرِ وطن نے اپنی ممتا بھری آغوش میں پالا پوسا اور بدلے میں ان ناہنجاروں نے ماں کی مانگ سے سیندور اور تن بدن سے کپڑے تک چرا کر اسے نہ صرف بے آبرو، بل کہ اسے بڑی بے غیرتی کے ساتھ الف ننگا کر ڈالا"(۵)

یہ افسانہ اپنے اندر متنوع پہلو سموئے ہوئے ہے۔ یہ قاری کی توجہ ایسے متعدد اہم سوالات کی جانب لے کر جاتا ہے جو یہ احساس بھی دلاتے ہیں اور سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں کہ اپنے ورثے اور ثقافت کی دیکھ بال کس قدر اہم معاملہ ہے اور ہم نے اپنے وطن کے ساتھ ابتدا سے ہی کیسا سلوک روا رکھا۔ دعویٰ وفا کا اور عمل بے وفائی سا۔ کیا ہمیں اب اپنے رویے بدلنے نہیں چاہئیں؟

"در منفعت پر دستک"، "کوکھ میں جے "علق" سے گفتگو"، "مرجھائی ہوئی کلیاں" اور "میرا جسم میری مرضی" سماج میں عورت پر روا رکھے جانے ظالمانہ رویے، جبر پر مبنی سلوک اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ردِ عمل کی داستانیں ہیں۔ سماج میں پائی جانے والی ہوس کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہاں یہ پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ مددگار

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

کون ہے اور ستم گار کون۔ ممکن ہے جو بظاہر انسانیت کی معراج پر فائز ہو وہ باطن میں اس کے برعکس مزاج کا حامل ہو اور جو بظاہر ناپسندیدہ ہو وہ باطنی سطح پر پارسائی کا مظہر ہو۔

نیر اقبال نے اس افسانے کے ذریعے معاشرے کے ان افراد کو بے نقاب کیا ہے جو چہرے پر دوہرا نقاب رکھتے ہیں۔ ان کا علم اور مرتبہ ان میں ذرا برابر بھی تبدیلی نہیں لاتا۔ یہ حیوان صفت انسان بظاہر عام انسان کی طرح اسی سماج کا حصہ ہیں۔ بظاہر کسی فعل سے غیر انسانی نہیں لگتے مگر موقع پاتے ہی اپنی اصلیت کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ انسانی صورتوں میں پنہاں حیوانوں نے صنفِ نازک کے مقام و مرتبے کو پامال کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ ایسے افراد دوسروں کی مجبوریوں اور کمزوریوں کو اپنی طاقت سمجھتے ہیں۔ انھیں جھوٹی تسلی تشفی دلا کر اپنے جال میں پھنساتے اور ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہی افراد معاشرے کی اعلیٰ اقدار کو پامال کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ انسان کے اعتبار و اعتماد کو ٹھیس پہنچاتے ہیں۔ افسانہ بعنوان "درِ منفعت پر دستک" میں روزینہ کو اس کے والد کی بیماری وقار احمد کی چوکھٹ پر لا کھڑا کر دیتی ہے۔ وقار احمد اسے ہمدردی کے جال میں پھنسا کر شادی کی نہج تک لے آتا ہے:

> "وقار احمد اس بے کس فیملی کو رام کرنے کی غرض سے غم گساری، اخلاص اور خدمت کے دل نواز پھندے ان کی گردنوں کے گرد کسنے کی سعی میں مگن۔ دن میں دو تین مرتبہ پھل، دودھ شربت کے لفافوں کے ساتھ حاضر ہوتا اور اس جذبہ خیر سگالی کے پیچھے اسے روزینہ کے دل میں جگہ بنانا مقصود تھا۔ جب کہ جہاں دیدہ مردم شناس بوڑھا مریض ماہر کھوجی بنا اس کی حریصانہ نگاہوں کا تعاقب کرتا رہتا۔ تاہم......... جنموں سے پلے پڑی بے بضاعتی و عسرت کی بدولت اپنی اپسرا کی بیٹی کو اس پُراسرار اجنبی کے بنے تارِ عنکبوت سے محفوظ رکھنے سے سراسر قاصر جو مکڑا بن کر اس پر جھپٹنے کے لیے زور و شور سے ہاتھ پانو مار رہا تھا۔۔۔ اس خوب سیرت مرد کے انسانیت ساز محاسن روزینہ کو بھی آہستہ آہستہ مائل کر رہے تھے کہ اسے قصرِ دل میں دخول کی
>
> اجازت دے۔ فطری طور پر شریف النفس، سادہ طبیعت اور اپنے بے گناہ حسن سے بے خبر لڑکی نے وقار احمد کے پُرکشش سراپے اور عالی ظرفی کی وجہ سے من میں جو پریم جوت جلائی اب وہ بھانبڑ کی شکل اختیار کرنے لگی اور اسی جذباتی آنچ نے ہی سفرِ زیست میں اس کے ہم رکاب ہونے کے فیصلے کو انگیخت کیا۔ دوائیں اور دعائیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرفِ قبولیت

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

> حاصل نہ کر پائیں اور بوڑھے کے اس جہانِ فانی سے کُوچ کا نقارہ پٹ گیا۔ البتہ موت سے قبل باپ ممنون ہو کر بیٹی کا ہاتھ وقار احمد کو سونپنے پر رضامندی ظاہر کر گیا"(۶)

شادی کے تھوڑے عرصے بعد جب ڈاکٹر اپنی ہوس پوری کر چکتا ہے تو روزینہ پر یہ خبر پہاڑ بن کر ٹوٹتی ہے کہ وہ نہ صرف پہلے سے ہی شادی شدہ تھا بل کہ دو بچوں کا باپ بھی تھا۔ لہٰذا ڈاکٹر، روزینہ سے دوری اختیار کرتا چلا جاتا ہے اور اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے۔ یوں ایک اور حوا ہوس کی بھینٹ چڑھادی جاتی ہے:

> "وقار احمد اس کے حسن و جمال کے پھولوں سے آراستہ وجود سے اتنا متلذذ رس کشید کر چکا تھا کہ اب اسے مزید حاجت نہ رہی، بل کہ اسے اپنے کاندھے پر بھاری بوجھ تصور کرنے لگا۔ بات بات پر برہم، چھوٹی سی غلطی پر سیخ پا، ذرا سی بھول چوک پر آسمان سر پر اٹھالیتا۔ اکثر اسے تنہا چھوڑ کر بنا بتائے ویک اینڈ پر اپنی پہلی بیوی کے پاس وقت گزارنے کے لیے چلا جاتا۔ اسے جیب خرچ دینا بند کر دیا"(۷)

انصاف تقسیم کرنے والے جب ناانصافی پر اتر آئیں اور لوگ ان سے غیر محفوظ ہو جائیں تو معاشرے میں بے چینی، لاقانونیت، بداعتمادی اور بے اعتباری کا چلن عام ہو جاتا ہے۔ "کوکھ میں جمے ہوئے "علق" سے گفتگو" بھی ایک وکیل کی داستانِ ہوس ہے۔ انصاف کے علمبردار ہی جب لوٹنے لگ جائیں تو معاشرہ بداعتمادی اور بے اعتباری کا مرکز بن جایا کرتا ہے۔ کتنے نام نہاد انصاف کے ٹھیکیدار اس مقدس پیشے کو ناپاک کرنے میں مصروفِ عمل ہوں گے۔ کتنی معصوم جانوں کی عصمت دری معمول بن چکا ہے۔ یہ دراصل ایک لڑکی کی کہانی ہے جو انصاف کے حصول کی خاطر ایک وکیل کے پاس جاتی ہے مگر وہ اس کی مجبوری پر اپنی ہوس کو ترجیح دیتا ہے اور اپنے ساتھیوں سمیت اس سے گینگ ریپ کرتا ہے۔ زینت کو جب ہوش آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ وکیل کے خلاف تھانے جائے شاید وہاں شنوائی ہو مگر پھر پولیس کے خواتین کے ساتھ روا رکھے جانے والے ہتک آمیز رویے کا سوچ کر کانپ کانپ جاتی ہے اور رکشا کرا کر گھر کی جانب روانہ ہو جاتی ہے:

> "دل میں ابھرنے والا پہلا خیال......... تھانے جا کر اس گینگ ریپ کی رپٹ درج کرواؤں، مگر دوسرے ہی لمحے پولیس کے خواتین کے ساتھ روا رکھے جانے والے ہتک آمیز رویے نے مجھ پر لرزہ طاری کر دیا کہ کس طرح وہ معاملات کی تہ تک جانے سے پیشتر ہی اچھی خاصی مظلوم و بے گناہ شریف زادیوں کو گشتیوں اور کنجریوں کے القابات سے نواز، بسا اوقات ان

کی عزتیں خاک میں ملا کر انھیں تھانوں سے باہر دھکیل دیتے ہیں۔ بادل نخواستہ گھر کی راہ لی، جہاں اماں وسوسوں سے متوحش اور انتظار کی شدت سے نڈھال چوکھٹ سے لگی کھڑی تھیں"(۸)

یہ افسانہ انسان کے باطن میں پوشیدہ درندگی کو ظاہر کرتا ہے۔ جہاں محافظ ہی لوٹنے لگ جائیں وہاں رہزنوں سے کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ نام نہاد آزاد معاشرے میں زندگی بسر کرنا ایک اور طرح کی غلامی ہے۔ جسے قبول نہ کرنا، کرنے سے زیادہ اذیت ناک ہے۔ اختتام میں یہ الفاظ افسانے کی فضا کو انتہائی رنجیدہ اور پُر ملال کر دیتے ہیں۔

"اے میرے جگر گوشے! ہم اَن گنت سالوں سے مہاجر کیمپوں میں کیڑے مکوڑوں کے مانند گل سڑ رہے ہیں اور شاید آیندہ صدیوں تک اسی شدت سے اپنے مقدروں کو پیٹتے، کوستے رہیں"(۹)

یہ آغاز سے انجام تک المیہ ہے۔ نیر اقبال نے بڑی دلیری سے عورت کے استحصال پر قلم اٹھایا۔ اس احساس کو واضح کیا گویا عورت ہونا کوئی جرم ہے اور سماج میں پائے جانے والے دوغلے انسانوں سے خبر دار کیا ہے۔ ظلم کا کسی قوم، قبیلے اور فرقے سے تعلق نہیں ہوتا۔ اس کا احساس تمام انسانوں پر یکساں نقوش چھوڑتا ہے۔ ایک بڑا اور سچا تخلیق کار حقیقت میں سب سے بڑا ہمدرد اور مُشفِق ہوتا ہے۔ وہ بلا امتیاز و تفریق سب انسانوں کا درد محسوس کرتا ہے اور اپنی صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ عصرِ حاضر میں تمام دنیا کے لیے مظلومیت کا استعارا فلسطین ہے۔ جس پر سرکش طاقت اپنا تسلط قائم کرنے کی مساعی میں ہے۔ افسانہ بعنوان "ابابیلیں کیوں نہیں آتیں؟" میں نیر اقبال بڑے پُر زور لہجے میں مسلم اقوام اور اقوامِ عالم کو ہوش کے ناخن لینے کی تلقین کرتے ہیں۔ ظلم و جبر کا نشانہ بننے والے سعد اور اس کے والد کی گفتگو کو مکالماتی پیرائے میں پیش کرتے ہیں اور یہاں تک سوال کر دیتے ہیں کہ خدا اب ابابیلیں کیوں نہیں بھیجتا؟ اس ایک سوال میں کئی سوال پنہاں ہیں جو خصوصاً مسلم اقوام کو غیرت دلانے کے لیے کافی ہیں۔ کیا ہمارا خدا پر اعتقاد پہلے جیسا نہیں رہا؟ کیا ہم مادیت پرستی کے شرک میں مبتلا ہو چکے ہیں اور اس قسم کے سیکڑوں سوالات بار بار مسلم اقوام کو اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایک معصوم اس ظلم کو دیکھتے ہوئے بڑی معصومیت سے اپنے بابا سے کہتا ہے۔

"بابا! ان یہودی وحشیوں نے ہسپتال، مساجد، گھر بار، سڑکیں، بازار، مارکیٹیں، باغات حتیٰ کہ بچوں کے سکول اور مہاجر کیمپ سب کچھ تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ کتنے دوست اِن ستم گروں

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

> کی گولیوں کا نشانہ بن کر بلا وجہ قبروں میں جا سوئے۔ میں پھر بھی بچے کھچے ہم جولیوں کے ساتھ مل کر روانہ دعا مانگتا ہوں کہ یا اللہ! اپنی ابابیلیں بھیج"(۱۰)

ان کے افسانوں میں ماضی کی بازگشت بڑے مضبوط اور جرآت مندانہ لہجے میں سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے اپنے اصل کی طرف لوٹنے کا اعادہ کیا ہے۔ اس کے لیے وہ منفرد اور زور دار لہجے میں اپنی صدا بلند کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ بیک وقت علت و معلول کا امتزاج ہے۔ وہ فقط مسئلے کی نشان دہی پر اکتفا نہیں کرتے بل کہ بڑی مہارت کے ساتھ اس کی وجوہات کا خاکہ بھی بنا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا افسانہ بیک وقت تاریخی دستاویزات کا درجہ بھی رکھتا ہے۔ ان کا افسانہ ہمیں اس ماحول کا تعارف فراہم کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوتا ہے اور ہم عہدِ گزشتہ کی نہ صرف سماجی بل کہ سیاسی سرگرمیوں کا بھی ادراک حاصل کرتے ہیں۔ یوں ہم بیک وقت کئی طرح کی معلومات سے آگاہ ہو رہے ہوتے ہیں۔ بقول اظہر غوری:

> "قدیم اقدار کی تنزلی، رشتوں کی شکست و ریخت، تعلقات کی مفاداتی سطحیت اور زندگی کی پیچیدگی کے بیان سمیت نیر اقبال علوی نے ہر موضوع کے وحدتی تاثر کو اپنے افسانوں میں جامعیت ارزاں کی ہے"(۱۱)

نیر اقبال کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جو وقت کے تیز رو دھارے میں بہتے ہوئے انسان کے ہاتھ میں اس کے ماضی یعنی اصل کی انگلی تھمانے کا بندوبست بھی کرتے ہیں اور عہدِ حاضر کے مسائل سے آگاہ بھی کرتے ہیں۔ ان کے افسانے شعور اور سیاسی بصیرت کے احساس کو فروغ دے رہے ہیں۔ یہ افسانے ادوارِ گزشتہ و حاضرہ کی حیرت سامانیوں کا امتزاج ہیں۔ کہیں وہ ماضی کے بے نشاں قصوں اور وقوعوں کا کھوج لگاتے نظر آتے ہیں تو کہیں اپنی سماج میں جاری ناجائز استحصالی، انسانیت سوز غیر جمہوری نظام کا نوحہ رقم کرتے ہیں۔

اردو افسانے کے ارتقا میں انھوں نے نہ صرف اپنے قارئین کو معاشرتی اقدار کے انحطاط اور اخلاقی تنزل کے خاتمے کی خاطر شرفِ انسانی کی شناخت کے قابل بنانے کی تدبیر کی ہے، بل کہ ترقی پسند خطوط پر شعوری پرداخت کے لیے کارآمد تخلیقی عمل میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ان کے افسانوں میں زیست کی کریہ و قبیح صورتِ حالات پر مبنی دستاویزی تصاویر ملتی ہیں جو ان کے وسیع تجربات و مشاہدات کا ثبوت بھی ہیں اور ادب کے قارئین کی فکری تربیت اور تہذیبی ارتفاع کا باعث بھی۔

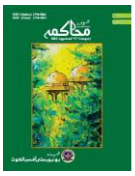

ISSN(Online): 2790-5861, ISSN (Print): 2790-5853

حوالہ جات

۱۔ محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، (لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۱۲ء) ص ۴۸۴

۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، (ملتان: کتاب نگر، ۲۰۱۷ء) ص ۷۵۷

۳۔ خالد محمود سنجرانی (بیک فلیپ)، جیب کترے از نیر اقبال علوی، (لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۲۴ء)

۴۔ نیر اقبال علوی، جیب کترے، (لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۲۴ء)، ص ۲۹،۳۰

۵۔ ایضاً، ص ۳۵

۶۔ ایضاً، ص ۲۳،۲۴

۷۔ ایضاً، ص ۲۶،۲۷

۸۔ ایضاً، ص ۴۳

۹۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۰۔ نیر اقبال علوی، جیب کترے، ص ۱۶

۱۱۔ اظہر غوری، نیر اقبال علوی: تہذیبی و تمدنی ادب کا نمائندہ افسانہ نگار، مشمولہ: جیب کترے از نیر اقبال علوی، (لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۲۴ء) ص ۸